فیصل آباد

نئے ادب کا ترجمان

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا
لسانِ سبزہ، رگِ خواب ہے زباں ایجاد
کرے ہے خامشی احوالِ بیخوداں پیدا
صفا و شوخی و اندازِ حُسن پا بہ رکاب
خطِ سیاہ سے ہے گردِ کارواں پیدا

(غالب)

P-240 رحمٰن سٹریٹ سعید کالونی مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

اپریل 2006ء

کلاسیکی ادبی ورثہ

اختر عثمان

"یہ مضمون حلقہ ارباب ذوق کھوڑ (پنڈی گھیب) کے سالانہ جلسہ پر خطبۂ صدارت کے طور پر پیش کیا گیا۔ (ادارہ)

ایک زمانہ تھا کہ ہم جیتے تھے ہمیں اپنے تہذیبی متون کو سمجھنے کے لئے کسی براؤن، کسی گلکرسٹ، کسی گارسیں دتاسی اور بہت سوں کی ضرورت نہ تھی۔ نکسن کی کیا مجال تھی کہ ہمیں عربی ادب کی تاریخ اور اقبال پڑھاتا! مگر اے وائے کہ آج ہم خیام کیلئے Fitzgerald، ابن العربی کیلئے Titus Burkhard اور حافظ و رومی کیلئے این میری شمل کے محتاج ہیں۔

کہاں تک نام لوں۔ مستشرقین کے ذکر کو دفتر درکار ہیں۔ عشق استشراق کا افسانہ ایڈورڈ سعید ایسا سنا گئے کہ روح کانپ اُٹھتی ہے مگر ذہن ہے کہ جسم کو سلانے پر تلا بیٹھا ہے۔ بقول شخصے ہم وہ کچھوے ہیں جو خرگوش کے سونے پر بھی ہار جاتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ کیا آپ نامور امریکی گائیکہ Madona کی ہیجان خیز اور شہوت انگیز آواز میں بزبان انگلیسی رومی سن کر کوئی عقل کی بات کر سکتے ہیں! ہمارے باکمال متون کو کیا کیا معنی نہیں دئے گئے مگر یہاں توقف کیجئے اور بتایئے کہ میر کو آہ، سودا کو واہ، اور انیس و اقبال کو مذہبی شعرا کس نے بنایا ہے؟ یہ سب کیا دھرا غیروں کا نہیں۔ ہم آپ بلکہ سب کے سب اس کارِ بدنام میں پوری طرح ملوث ہیں آج کسی بھی ادبی محفل میں عربی فارسی تو کجا کلاسیکی اردو شعر پڑھنا رجعت پسندی کی علامت ہے۔ میر و غالب اور انیس تو خیر" بے چارے" بہت پرانے ہیں اقبال جو قومی شاعر ہیں ہماری دستبرد سے محفوظ نہیں۔ ہم اقبال کے از نصف فارسی کمالات کو فراموش کر کے

کس منہ سے انہیں قومی شاعر کہتے ہیں۔

یہ ماضی کا ماتم نہیں ، انہیں بصیرت افروز چشموں کی ہڑک ہے جو پیاس بڑھاتی ہے لیکن "آبِ حیواں" کے ورثہ داروں کا ایسا عبرت ناک انجام چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا ہوگا ۔ اردو کلاسیکی سرمایہ سے توانا رشتہ قائم کرنے کے لئے شہکار فارسی ادب کا گہرا ادراک لازم ہے اور اقبال ہمارے واحد شاعر ہیں جن تک رسائی جدید علوم کے بغیر محال ہے ہمیں اگلی نسلوں کو اپنے اسلاف کے علمی ادبی کارناموں کی طرف راغب کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے شائد ہی کبھی رہی ہو ۔ کتاب کا فروغ اور تمیز انتخاب اس سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں تا کہ مغرب کا ہر گھٹیا لکھنے والا ہمارا رول ماڈل نہ بن سکے ۔ عالمی ادب کے ساتھ ہمارا تعلق آقا غلام کا نہیں ۔ اگر ہم آزاد ہیں تو ہمیں اسیری اور وابستگی میں خطِ امتیاز کھینچنا پڑے گا ۔ یقین مانیے کہ آج مغرب سے جو نئے نئے "ادبی لسانی رجحانات" آ رہے ہیں اور ہمارے نقاد انہیں ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ انسان دوست صورت میں مولوی اور بیدل کے یہاں مل جائیں گے ۔ مغرب کے ساختیاتی مفکرین نے مصنف کا ابطال کر کے جس طرح قاری کو تعبیر کے جملے سونپ دیئے ہیں اس سے تیسری دنیا کے واحدانی تصور حقیقت (بھلے وہ تہذیبی ہو یا مذہبی) پرزد پڑتی ہے لکھاری کا انکار اور قاری کا اقرار دراصل استعمار کی وہ چال ہے جس کے توسط سے تیسری دُنیا میں موجود اس جوہر کی بیخ کنی منظور ہے تا کہ وہ کسی Binding Force کی شکل میں عالمی سرمایہ دارانہ استعمار کے روبرو ہو کر اس سے مبارز طلب نہ ہو سکے ۔ سچ پوچھیئے تو موجودہ عالمی سیاسی معاشی منظر نامہ کو اچھی طرح سمجھے بغیر ادب کی تفہیم ممکن ہی نہیں ۔ مغربی معاشرے کا ادیب اسی سرمایہ دارانہ نظام کا حصہ ہے اور اپنے معاشرتی مفادات کا محافظ بھی ادھر ہمارے نقاد ہیں کہ اس آزادئی کو (جو مرغ گرفتار کے پاؤں ہے دندنانے کا کوئی مہذب طریقہ نہیں لیکن ادب میں بقراطیت اس قدر زوروں پر ہے کہ محض ایک آدھ گھنٹہ کی Net Club میں کھپا کر آپ یہ میدان مار سکتے ہیں اگر ادبی عدالت میں بھی انسان دشمن رویوں کی سماعت نہ ہو سکے تو نقد ادب ایک داخل دفتر مسل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ جدید علوم کے ذریعے فن پاروں کا مطالعہ سودمند سہی مگر یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ اس عمل میں خود فن پارہ ہی سب سے معقول راستہ ہے ۔

نقد ادب معنی یابی کا مضمون ہے البتہ و تاہم کا نہیں ۔ ذرا بتایئے کہ ہمارے "ادبی علما" نے خسرو سے اقبال بلکہ راشد تک اور میر امن سے غلام عباس تک کے یہاں کون سے کمالات دریافت کئے ہیں؟ محقق متن تیار کر کے دے گا تو نقاد کچھ موشگافی کرے گا۔ انگریزی کا غوغا ہے اور حال یہ ہے کہ وہاں بھی مطالعہ ایسا ہے جسے محمد حسین آزاد نے بکریوں کا باغ میں گھسنا کہا تھا یعنی پودے بھی خراب کئے اور پیٹ بھی نہیں بھرا۔ جدید اردو تنقید میں حوالے، حواشی اور مآ خذ سب کچھ ملے گا اگر نہیں ہے تو تفہیم، یعنی اصل کام ۔ دراصل اس مخلوق کا بھی کوئی قصور نہیں جسے نقاد کہتے ہیں بقال صائب:

بود ملال بمقدار مال ہر کس را
بقدر روغن خود ہر چراغ می سوزد

ابنِ راشد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کے حافظے میں صرف دو ایسی راتیں محفوظ ہیں جن میں وہ مطالعہ نہیں کر سکا ایک اس کی شب زفاف (سہاگ رات) اور دوسری اس کی والدہ کی شب وفات ۔ پہلی رات کا تعلق تو خیر جمالیاتی تجربے سے ہے جو کم از کم جدید اردو ناقد کو نصیب نہیں ہوا، دوسری البتہ اس کی ساری زندگی پر چھائی رہتی ہے ایسے میں کلاسیکی کارناموں کی تفہیم کیلئے خود سنجیدہ تخلیق کاروں کو سعی کرنا ہوگی ۔ بد قسمتی سے اس میدان میں جو دو اڑھائی لوگ ہوئے اب ہم میں نہیں ۔ سو ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنی تومند روایت سے روشنی پائیں اور پھیلائیں ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اقبال کی ایک فارسی نظم کا مطالعہ کے دوران حاصل ہونے والی مسرت میں آپ کو بھی شریک کروں ۔ یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تنقید کی زبان بھی زیر تجزیہ فن پارہ ہی متعین کرتا ہے ۔

وجود کیلئے شعور کی پیشگی شرط اگر چہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی فکر، تاہم بیسویں صدی میں اس قضیہ کو ایک منضبط نظام فکر کے طور پر پیش کرنے کا سہرا ژاں پال سارتر کے سر بندھتا ہے شعور اپنی کارفرمائی میں تجسس، سوال، تلاش و تفتیش اور تگ جاودانہ کے کراں تا بہ کراں جہانوں کا سیلانی ہے اور کوئی بھی جبر اسے زنجیر نہیں کر سکتا بلکہ قدغنیں تو اس کے مہمیز کا کام دیتی ہے ہر نوع بعض خارجی اور اکثر داخلی ضروریات کے تحت فطرت کے دائرہ جبر کو

توڑنے کی سعی کرتی لیکن محدود صلاحیتوں کی بنا پر تعینات سے نکلنا کچھ سہل نہیں ۔ یہ کمال فقط صاحب شعور کوارزانی ہوا ہے کہ کریدے اور معلوم کرے۔

قدرت سوال سے محروم دیگر انواع کے برعکس انسان اس جوہر کا حامل ہے مگر اختیار و انتخاب کے دہن کشودہ نہنگ پوری قربانی کے ساتھ قدم قدم اس کے مقابل ہیں سارتر کے نزدیک اختیار صرف اسی قدر ہے کہ انسان دکھوں کے انبار میں سے ایک دکھ ہمیشہ کے لئے اپنے واسطے چن لے، ایسا دکھ جس کے ساتھ ساری زندگی بتائی جا سکے۔ کیونکہ ہستی اپنی انتہا اور کلیت میں فنا پذیر ہے اور انتخاب کا حق صرف ایک تفویض ہوا رہا ہے دیگر انواع کے برعکس انسان صرف اپنی نوع سے مکالمے اور مخاطبے پر اکتفا نہیں کرتا اظہار کے اکمل جوہر، یعنی زبان، کا حامل ہوتے ہوئے بھی فکر کے بعض منطقے ایسے ہیں جہاں نکتۂ اشتراک کی کوئی صورت نہیں بنتی اور سوال اپنی تنہائیوں میں بھٹکتا رہتا ہے تنہائی سوال کا منبع و مخزن ہے، ہستی کے لمحۂ اولین سے لمحۂ موجود تک مختلف جبلی و سماجی خوف انسان کو جکڑے ہوئے ہے مرنے کا خوف، اشتہا کا خوف، قانون کا خوف اور عدم شناخت کا خوف وغیرہ۔ تنہائی خوف کی بدترین شکل ہے اگرچہ ہر جاندار کا زوج یعنی جوڑے کی صورت میں ہونا قدرت کی طرف سے تلافی، تنہائی کی ایک موہوم کوشش ہے لیکن شعور کی برتر سطح پر یہ تلافی بھی ناکافی معلوم ہوتی ہے معاملہ محض ہم نفسی و ہم قدمی تک محدود نہیں رہتا۔

شعور کا آفتاب نصف النہار تک پہنچ کر ہم نظری کا مطالبہ کرتا ہے اس مظاہرے سے گفتگو کا لپکا روز اول سے انسان کی داخلی آرزو رہا ہے اور اس یکطرفہ گفتگو سے نئے نئے سوال مرتب ہوتے رہے ہیں یوں تنہائی تعینات کے منطقوں سے نکل کر کونیاتی معاملہ بن جاتی ہے استفہام کا جوہر انسانی خمیر میں اس درجہ وافر ہے وجود اور جوہر ایک ہی چاک پر گھومتے معلوم ہوتے ہیں اور اسفال سوال کے خدوخال واضح ہونے لگتے ہیں۔ صاحب جوہر اپنی نوع کی استعداد کو ناکافی سمجھتے ہوئے کسی ایسے وجود کی جستجو میں نکل پڑتا ہے جو تجسس کی بھڑکتی ہوئی لو کے بالمقابل آ کر اسے آسودہ جواب کر سکے کائنات سے ہمکلام ہونے کا شرف دوسری مخلوقات کو حاصل نہیں کہ اس اعزاز کے لئے حرکت و توانائی کے علاوہ بھی کچھ درکار ہے جسے اہل فکر نے چیزے دگر کا نام دیا ہے اور ژاں پال سارتر کی دلچسپی اسی امتیاز سے تھی لیکن انسان

کی کوشش پیہم کا ٹمٹماتا دیا ہمیشہ اس کی نظروں سے اوجھل رہا ہے اور اسے کائنات کی ظلمات بے پایاں میں سرخوشی و روشنی دکھائی نہ دی سو وجود اس کیلئے مجبور محض کے علاوہ کچھ نہیں۔

اقبال نے جتنا کچھ اور جیسا کہہ رکھا ہے اس کا حاصل انہیں عشق کی صورت میں توفیق ہوا ہے اقبال کی شاعری کا مرکز عشق، انکے عشق کا مرکز دل اور ان کی فارسی شاعری کا دل ان کی نظم ''تنہائی'' ہے یوں تو انہوں نے اس عنوان کے تحت ایک اردو نظم بھی کہہ رکھی ہے لیکن فارسی نظم میں آفریدگار زمان و مکاں سے وہ مرعوبیت نہیں جو اردو نظم سے مخصوص ہے۔ اردو نظم کا لہجہ استعجابیہ ہے اور فارسی کا ستفہامیہ۔ استعجاب عجز انکسار اور اسراریت سے متصف کیفیت ہے گویا ایک خاموش پانی، سہمے سہمے انداز میں بہتا ہوا جبکہ استفہام شعلہء جوالہ ہے روبرو ہو کر آنچ سمیت اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتا ہوا بلکہ حافظ کے لفظوں میں کلامِ رندِ خراباتی۔

تُرکی کی فتح قسطنطنیہ کو ابھی نصف صدی ہی گزری تھی کہ عدم مرکزیت کا شکار ہو کر بکھرنے والے علوم کسی نئی جہت نمائی کے بغیر رخصت ہو گئے۔ دو عظیم جنگوں کے بعد احساس تنہائی کی مختلف صورتیں نئے ادب کا حصہ بنی اور بیسویں صدی کے ادب کا سب سے بڑا سوال تنہائی ٹھہرا۔ ۱۹۱۸ کے بعد علوم کی انسان مرکز حیثیت ختم ہو گئی اور بربریت اور بہمیت نے نئے خدشات و احساسات کو جنم دیا یوں انسان کا انسان سے اعتماد اُٹھ گیا اور وہ اپنے بچاؤ کے لئے دیگر مخلوقات کے بطون میں پناہیں تلاش کرنے لگا کافکا کی معروف کہانی Metamorphosis اسی احساس کی دین ہے علاوہ ازیں T.S Eliot کی نظم The waste land، allen Ginsberg کی نظم How I اور Gabriel Garcia Marques کا ناول One Hundred Yeard of Solitude بھی اسی موضوع پر استوار ہیں اردو میں فیض اور مجید امجد ان فنکاروں سے قطع نظر اقبال کی فارسی نظم ''تنہائی ایک جداگانہ نوعیت کی تخلیق ہے ان کے دوسرے فن پاروں کی طرح یہ نظم بھی تمثیلی ہے ایسی تمثیل جو خارج سے کردار منتخب کرتی ہے اور فنکار کے اندر ہی کہیں چلتی ہے راوی کے سوا تمام کردار خاموش ہیں اور وقت کا تعین صرف چاند کی موجودگی سے ہوتا ہے کہ رات کا کوئی پہر نظم ایک گھمبیر خود کلامی سے آغاز ہوتی ہے۔ شاعر موج، کہسار مہتاب اور

یزداں سے استفسار کرتا ہے لیکن کوئی جواب نہیں دیتا۔ بجز اس کے کہ یزداں کے ہونٹوں پر ایک تبسم بکھر جاتا ہے غم کی تلاش اسے ساحل تک لے جاتی ہے اور ایک سوال تکرار تمنا کے طور پر نظم کے ہر بند میں گونجتا ہے موج کی جنبش، سمندر میں اسکی اچھل کود اور ہموار سمندری فضا میں اسکی کشیدگی یہ احساس پیدا کرنے کے لئے کافی ہے کہ تحرک جذبے سے الگ کوئی چیز نہیں۔ شاعر پوچھتا ہے۔

ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری
ہزار لو لو و لا لاست در گریبانت
درون سینہ چومن گوہر دلے داری

لیکن یہ کیا:

تپید وازلب ساحل رمید و ہیچ نہ گفت

گویا اپنے اندران گنت و گہر رکھنے کا باوصف موج متاع دل سے واقف نہیں اقبال نے موج کو ایک خوفزدہ غزال کی طرح رمیدہ دکھایا ہے جو شکاری کے جال میں صید سوال کی صورت نہیں رہنا چاہتی موج آزاد منش اور آزردہ بوندوں کا مجموعہ ہے لیکن زمین کے سینے پر ٹکے رہنا اس کے اختیار میں نہیں اس لئے رمیدہ کا لفظ عدم اطمینانی کی طرف اشارہ تو کرتا ہے مگر یہ بے کلی دل کی عطا نہیں بلکہ احساس کی کسی بھی سطح سے عاری ہے اور ایک جبر کی صورت اس پر مسلط۔ لعل و گہر موج کو کوئی توقیر اور شادمانی نہیں دے سکتے بلکہ وہ تو اس خزانے سے ہی لاعلم ہے بے خبری اہل دل کا وطیرہ نہیں۔ شعور تو جاننے اور چھاننے کی مسافت ہے ہمہ سرگردانی، ہمہ کاوش و کد، کنارہ چھوڑ کر خاموش لوٹنے میں بھی موج کی رضا کا دخل نہیں کہ وہ تو ساحل سے ٹکرائی ہے اور سماعت و گویائی کے اوصاف سے قطعی محروم ہے سو سوال ناشنیدہ ہو کر فضا میں چکراتا پھرتا ہے۔

سر ساحل تک کا یہ بے ثمر سفر فنکار کو کہسار تک لے آتا ہے اور نظم زمین سے اٹھنے لگتی ہے۔ موج کی حرکت و روانی کے مقابلے میں کہسار کا بھاری وجود محکمی بتاتی ہے کہ استقلال لازمی طور پر کسی یقین کا نتیجہ ہے رنگ رنگ کے پتھر سنگینی کے باوجود لبھاتے اور رجھاتے ہیں تو کیا عجب ہے کہ یہ پابہ گل اور قوی الجثہ شے بھی دل رکھتی ہو۔ پوچھنا چاہیے

رسد بگوش تو آہ و فغاں غمزدہ؟

اگر بہ سنگ تو لعل ز قطرہءِ خون است

یکے در آبہ سخن بامن ستم زدہ!

لیکن یہاں بھی کچھ مختلف حال نہیں

بہ خود خزیدو نفس در کشید و ہیچ نہ گفت

گویا یہ بات گمان تک ہی رہتی ہے کہ دوسری جانب سے کچھ سنا بھی گیا۔ سبک سری میں کسی نوبیاہتا کی طرح چھوئی کی کیفیت بیان کرتے ہیں وہاں جسیم نوع کی تہی دامنی اور حیرت ناکی بھی دکھاتے ہیں نفس کشیدگی میں مبہوت ہونے سے زیادہ سوال کے عجیب ہونے کا تاثر ملتا ہے۔ پتھروں کا انبار استطاعت جواب تو درکنار سماعت سوال سے ہی معذور ہے استفسار نے اگر کچھ تبدیلی کی بھی تو اتنی کہ خامشی زیادہ گھنی ہوگئی ہے۔ چٹانیں تو بات منہ پر دے مارتی ہیں۔

سوال کے کچوکے شعور کو سر بہ گریباں نہیں رہنے دیتے اور تنہائی کا راہی نئی منزلوں کا نکل پڑتا ہے قلمرو فلک پر خسروانہ خرام کرتا ماہ دو ہفتہ پوری تابانی سے ستاروں کے جھرمٹ محو سفر ہے خلا اندر خلا بھٹکتی سیماب صفتی دودھیا دائرے میں آ ٹھہرتی ہے۔ مہتاب کے داغ دھبے کسی گہری کسک، کسی پھانس اور کسی ناشگفتہ ارمان کا پتہ دیتے ہیں استفسار کا پھول شاخِ لب چھوڑتا ہے اور ایک بار پھر استفہامیہ کی چرخی گھومنے لگی ہے:

سفر نصیب! نصیب تو منزلے ست کہ نیست؟

جہاں ز پر تو سیمالے تو سمن زارے

فروغ داغ تو از جلوہء دلے ست کہ نیست؟

یہاں بھی بے مائیگی ہے:

سوئے ستارہ رقیبانہ دیدو ہیچ نہ گفت

مخاطب جواب دینے کی بجائے ایک ستارے کی طرف دیکھنے لگتا ہے گویا سوال باریاب نہیں ہوسکا۔ مانگے تانگے کی روشنی پر جینے والا بھلا دل ایسی نعمت غیر مرقبہ کا حامل کیسے ہوسکتا ہے دل تو خودی شعور اور عشق کا آفرینندہ ہے اور عشق کی بے کنارا اقلیم میں عطا ہی عطا

ہے دین ہی دین ہے یہاں تقاضا نہیں ہار سکتا خودی کے چراغ میں ذات پر فروغ رہتی ہے اور شعور اس کی سرحدوں پر چوکس نگہبان کی طرح حرص وہوس کی ہواؤں کو روکے رکھتا ہے یقیناً مہتاب کے داغ مفلسی، ذات اور بے بساطی شعور کے باعث ہیں یوں بھی چاند پر کہنے سننے کی رسم نہیں سو بات خلاؤں میں سر مارتی پھرتی ہے۔

بھڑک فزود ہو گئی ہے اور شعور انتہائی شکل میں ڈھلنے لگا ہے جنوں اقبال کے یہاں شعور کی مصفا صورت ہے (Superconscious) لیکن عشق کے تابع ایک جوہر اگلی منزلوں میں زمین کی کشش اور کم ہو گئی ہے اور قریۂ مہتاب سے سفری کے قدرم خود بخود اوپر اٹھنے لگے ہیں وہ انتہائے عرش تک جا پہنچتا ہے اور خود کو یزداں کے عین سامنے پاتا ہے، یہاں زماں و مکاں کا کوئی تصور نہیں ہر طرف گھمبیرتا ہے مرگ آثار خامشی۔ بڑا سوال اور بڑا سخن تنہائی میں جنم لیتا ہے اور سناٹے میں پرورش ہوتا ہے سو اپنی بات کہنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے! استفسار کی پھوار دامن یزداں پر جا پڑتی ہے:

که در جہاں تو یک ذرہ آشنا یم نیست
جہاں تہی زدل و مشت خاک من ہمہ دل
چمن خوش است و لے در خورِ نوا یم نیست

فنکار کی خود اعتمادی فزوں تر ہے اوہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے صانعِ ازل سے مخاطب ہے اور اس کی یہ خود اعتمادی ''ایاغ آفریدم'' اور ''چراغ آفریدم'' کے فخر سے مملو بھی۔ حقیقت عظمیٰ سے آنکھیں چار کرنا کسی ژولیدہ مو اور سر بہ زانو فنکار کا کام نہیں۔ یہاں تو ہمت مردانہ چاہیے جو اپنے جنوں میں یزداں پر کمند سوال پھینک سکے۔ اب کے کچھ تغیر ضرور رونما ہوگا مگر اتنا کہ نظم زمیں سے آسمان کی آخری حد تک آ پہنچی ہے یہاں سے آگے کچھ نہیں بس خندہء یزدان کی ایک جھلملاتی لکیر ہے اسے اتھاہ سوال کی جواب میں خندہ موہوم کیا معنی رکھتا ہے!

معنیٰ کے امکانی علاقوں تک رسائی ہی اصیل نقد ادب کا بنیادی فریضہ ہے جس سے عہدہ برآئی کے لئے متن کی پنہائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔ ایک متن خارجی عوامل کی قبولی میں بہت زیادہ سخی نہیں ہوتا کہ ہر قسم کے مباحث کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے گو کہ ان سے کچھ نہ کچھ مدد ضرور مل جاتی ہے تفہیم کے سارے نکات زیریں سطح پر متن کے اندر ہی کہیں موجود

ہوتے ہیں اگر ناقد فنکار کے درجہ احساس اور مرتبہ شعور پر ہونا بنیادی شرط ہے نقد ادب
احساس شعور اور شعور احساس کا مضمون ہے ساختوں کی تعمیر میں لفظ اور فقرے خود کفالت کے
مرتبے سے اتر کر یوں باہم پیوست ہو جاتے ہیں کہ حتمی معنی کا جبر حدود متن سے خارج ہو جاتا
ہے۔دراصل ناکشودہ ساختوں کی پرتیں کھولنا ہی معنی یابی کا واحد اور معتبر رستہ ہے بدقسمتی سے
اردو تنقید میں فن پارے پر اپنے معنی جاری کرنے کی روایت بہت عام ہے جو نقد ادب کے
متوازی کوئی شے تو ہو سکتی ہے لیکن تنقید سے اس کا کوئی علاقہ نہیں معنی ایک عرصہ تک بحروں کی
صورت میں متن کے ناپیدا کنار سمندر میں ڈوبے رہتے ہیں لہذا آس پاس کے چھوٹے
چھوٹے جزیروں پر بیٹھ کر اس سے متعلق کوئی رائے قائم کرنا نسبتاً آسان کام ہے جبکہ ایک
صاحب جوہر ناقد نامعلوم بحروں تک رسائی کے بار بار شناوری کرتا ہے یہی محسوس کو معلوم میں
ڈھالنے کا عمل ہے۔اس تنقید سے کیا حاصل جو شاہکار ادب پاروں کو بھی البتہ و تاہم کی بھول
بھلیاں میں گم کردے ہمارے کلاسیکی فنکار ایک مدت سے ناقدین کے اسی قبضہء غاصبانہ کا
شکار چلے آتے ہیں سو اقبال کے فارسی تو الگ اردو کمالات ہی ابھی پوری طرح دید نہیں اپنے
ادبی ورثے سے یہ تعلو ہماری تنقید کا منہ چڑاتا ہے۔

اس جملۂ معترضہ کی ترتیب میں سوائے اس کے کوئی امر داخل نہیں کہ ایک شہ
پارے کی تخلیقی تفہیم میں بہت سارے علمی عناصر کے علاوہ ایک خاص قسم کی درا کی بھی کام آتی
ہے جو فنکار کے وجدان میں اُتر سکے منطقی انجام تک پہنچ کر تمام ہونے والی اکثر نئی اور پرانی
نظموں کے برخلاف اقبال کی نظم ''تنہائی'' کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو جاتی ہے اب یہ ایک ناقد کا
فریضہ ہے کہ وہ یزداں کے تبسم کی کیا تفسیر کرے اور یہیں پانی مرتا ہے۔ایک ممکنہ تعبیر تو یہ کے
مظاہرہ و مخلوقات میں سے کوئی بھی اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جہاں حضرت انسان کے قدم
جا ٹکے ہیں سو دل رکھنے کا ثمر حقیقت تک رسائی کے سوا کیا ہو سکتا ہے لیکن یہاں ایک اور سوال
اُٹھتا ہے کہ کہیں خود یزداں تو تنہائی کا شکار نہیں اگر ایسا ہے تو کیا اس کی تنہائی کوئی وجودی
حیثیت رکھتی ہے؟ مگر یزداں تو وجود کے جھمیلوں سے ماورا تصور ہے دوسرے یہ کہ مظاہر
فطرت سے جواب نہ ملنے پر اتنا لمبا سفر صاحب سوال کو کیا دیتا ہے یقیناً اس کا مقصود محض تبسم
نہ رہا ہو گا بھلے اس کے کتنے ہی مفہوم کیوں نہ ہوں فطرت سے اقبال کا تعلق Words

worth کے تصور فطرت سے بہت فاصلے پر واقع ہے کہ ان کی یہ نظم وحدت الشہود سے انکار کرتی ہے خندہء یزداں میں جرأت انسان اور اس کی معراج فکر کی داد بھی ہے اور اپنی تنہائی کا اشارہ بھی کائنات لامحدود میں مظاہر کے ساتھ کروڑوں برس گزارنے کے باوجود انسان فطرت سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا اور شعور اسے ایک متوازی کائنات تخلیق کرنے پر ہمہ وقت اکساتا رہتا ہے۔

ایک فنی سطح پر اقبال کی نظم انوکھی چھب دکھاتی ہے ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہے ۔ پہلا مصرع چار مصرے نفس مضمون کے تقاضے کے طور پر بلند آہنگ ہیں جبکہ ہر بند کا آخری مصرع ایک غنودہ و خوابیدہ لے کا حامل ہے جس میں لہر، پہاڑ اور چاند کی ہیچ مدانی پوری کیفت کے ساتھ منعکس ہوتی ہے آخری مصرع صوتی لحاظ سے بھی شکستہ و خستہ، اور واماندہ نوع کا تصور ابھارتا ہے۔ نظم کے چاروں بند اسی تقسیم پر قائم ہیں۔

سارتر سے مرعوب ہو کر انسان کے جوہر کی داد نہ دینا اقبال ایسے رجائی اور کامل فنکار کی طریقت نہیں ان کے نزدیک زندگی دکھ اور سکھ سے زیادہ پیہم تگ و تاز اور سرمستی ء عشق سے عبارت ہے منزل کا لطف اپنی جگہ لیکن مسافت کی دلکشی ہی درحقیت تخلیقی فنکار کی کمائی ہے۔ تخلیق سے زیادہ تخلیقی عمل سے سروکار رکھنے میں یہ نقطۂ پنہاں ہے کہ کامیابی اور ناکامی ضمنی و ذیلی معاملات ہیں ۔ سفر ہی دائمی ہے اور اقبال فلسفی کے نتیجہ نکالنے سے زیادہ مراحل فکر سے شغف رکھتے ہیں اور یہی فلسفیانہ روش ہے۔

نظم کی پیش کردہ تعبیر سے یہ مراد نہیں کہ یہ ایک فن پارہ کے سلسلہ میں حتمی کوشش ہے۔ ہم اپنی کاوشیں بروئے کار لاکر اپنے تہذیبی ورثے سے اتنا کچھ سیکھ سکتے ہیں جو بیان سے باہر ہے ایک زمانہ تھا جب حلقہ اربابِ ذوق میں تنقید کے لئے پیش کے جانے والی تخلیقات کو ناقد ایسے دیکھتا تھا جسے احمد شاہ ابدالی کی طرف۔ ہم جب تک اپنے کلاسیکی اور معاصر ادب کو دیانتداری تنقیدی نظروں سے نہیں پرکھیں گے حال و استقبال کے امید افزا دریچے ہم پر وانہ ہو گے۔